

# اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۴)

## ایمان و ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیاتِ آخرت، اور دارِ آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت بتائی گئی ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا اس کے اعمالِ فحارت ہو جاتے ہیں۔ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۰۰: ۱۰) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اللَّهُ (۱۰۰: ۶)۔ حیاتِ اخروی کا اعتقاد جس کو اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب

ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

**چند فطری سوالات** | انسان خوشی سے زیادہ غم اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حیات کو جتنی زیادہ بھیس لگاتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوتِ فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو محال ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اور کب تک چلے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے دماغ پر ایک تازہ لگا دیتا ہے، اور ہم سوچتے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟

اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہیں کبھی پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں، اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں بخلاف اس کے موت اور اس کی بلینوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے موقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے۔ سکیں اور کمزور بھی مرتے ہیں، طاقت اور مہمیت والے بھی مرتے ہیں، حسرتناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں، عبرتناک موتیں بھی پیش آتی ہیں، اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر اپنے گزرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گزرے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن پیدا نہ کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گزر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عالم سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لیکر ایک بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہیں لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے، ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے، جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان میں سے ہر فعل کا روفل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر گوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہئے۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل بُرا ملنا لازم ہے۔ اچھی گوشش کا

اچھا نتیجہ اور بری کوشش کا برا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے، مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام سعی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گزاری، بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا، کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا، کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کونسی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شہر کے ظلم، اور مظلوموں کے صبر سب کے سبے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے، بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے، اور ان کا پورا پورا ثمرہ انھیں دنیا میں نہ ملا، بعض نیکیوں پر ان کی الٹی بدنامی اور رسوائی ہوئی، بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے، بعض نیکیوں پر انہیں سزا میں لیں، بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا ثمرہ اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے قہر یہ کارخانہ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیاتِ اخروی کا اعتقاد و دراصل ان ہی سوالات کا جواب ہے۔ لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے رکھنا چاہیے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہیں؟

حیاتِ اخروی کا انکار ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، احساس، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ ان

هُؤَلَاءِ لَيَقُولُونَ إِنَّمَا هِيَ إِلاَ مَوْتُنَا الِأُولَىٰ وَ مَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ (۴۴: ۲) وَقَالُوا مَا هِيَ الِآخِرَةُ إِنَّا لَبِئْسَ مَا كُنَّا لِنُحْيِيهَا لَآئِن مَّوْتًا وَ نَحْيَا وَ مَا يَهْلِكُنَا الِآلَآءُ هُرُ (۴۵: ۳) بخلاف اس کے

یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ بھی درہم بہم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے، اور فی الواقع یہ کارخانہ عالم لازماً ال ہے۔ لہذا

دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی، اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے۔ مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیا کا وجود اور ہمارا عدم احساس ہی اشیا کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے، وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے، اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے بہتے دیکھا، اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل آدمی اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت جو نوحہ ہم کو معلوم نہیں اس لئے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض جو اس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض جو اس کے بل پر لگائے جاتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر کارخانہ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا، تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آتی ہے جو اس کے کبھی آئندہ مگرنے کی پیش گوئی کرتی ہو کیا میرا استدلال

ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر | فلاسفہ اور حکما راب قریب قریب اس خیال پر تفرق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظام عالم ضرور درہم برہم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور عبدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریہ کو دہرانے والا شاید آج اہل علم کی جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم ابھی تک موت کو فنا کے محض کہنے والے بہت بے باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس کی غیر معقولیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے معاملات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس قول میں تشنہ جواب ہی رہ جاتے ہیں۔ علاوہ برین اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تمیر اس اعتقاد پر قائم ہو، تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی: <sup>ایک</sup> موافق حالات میں اس سے شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی کیونکہ جب وہ اپنی شوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا۔ تو اس کی قوتِ عمل سرد پڑ جائیگی جبکہ اپنی منطوقی کی وادری کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور جب وہ شریروں بدکاروں اور ظالموں کو دیکھا۔ پھلتے پھولتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم تہی میں شری کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔

مخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست جو ان بن جائیگا۔ وہ خیال کرے گا کہ زندگی کے جو دن عیش اور لطفہ میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔

اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطفت سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اسکی کسپوری ہو وہ ظلم و ستم کر سکیا کوئی حقوق غصب کرے گا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ تنگی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جو انم کو جو انم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جن کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو رہا ہے وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوگی۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو، تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ ایسی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائیگی۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو عین صواب بن جائے گا۔ صداقت اگر دنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بصورت نقصان اس سے بڑھ کر کوئی بدی نہ ہوگی۔ زنا لذت اور عیش کے لئے مستحسن ہوگی، اور اس میں برائی کا پہلو اگر کبھی پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جبکہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بڑے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا نتیجہ واقع ہو جائیگا۔ جو ہرگز کسی جہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گروہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر و رجہ تک گرنے لے گا۔

نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اور جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں ہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام ضمیر ہے۔ اس کی طاقتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے لیکن اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھرنے لگتا ہے اور وہ ان افعال پر سرزنش کرے گا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، اور ان افعال میں اطمینان محسوس کرے گا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

**نظریہ تشاخص** | دوسری جماعت وہ ہے جس نے تشاخص کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے

بلکہ موت کے معنی فنا ہے جس کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال بُرے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بُری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی، اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں

اس نے بہم پہنچائی ہیں تو روح اعلیٰ طبقتوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور انہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح! برابر اسی دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے یونان میں مسیح سے کئی صدی قبل فیثاغورس اور انہذاقلس (Pythagoras) وغیرہ اس کے قائل تھے، روم میں بھی سمیت سے پہلے اس کا چرچا تھا، مصر کی قدیم تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی بیرونی اثرات سے تناسخ کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا، لیکن اب یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذاہب دہرمنیت، بودھ مت، جن مت وغیرہ میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مدغاسکر، وسطی ایشیا، انڈونیشیا، اوشیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مذہب تو میں اس کو رد کر چکی ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت بہم پہنچائی ہے وہ ان تمام نظریات کی تردید کرتی ہے، جنہیں نظریہ تناسخ کی بنا قائم ہے، خود ہندی الاصل مذاہب میں بھی حیم کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بہم معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک ہندوستان میں یہ خیال سرے سے موجود ہی نہ تھا اس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکو کاروں کے لئے بہتر اور بدکاروں کے لئے سزا ہے اس کے بعد دفعہ اس نظریہ میں تیسرا واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندو لٹریچر میں ہم کو وہ کتابیں ملتی ہیں جن میں تناسخ کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے اس تغیر کا سبب ابھی تک محقق نہیں ہو سکا ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ خیال آریوں میں قدیم ڈراوید قوموں سے آیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خود آریوں کے ادنیٰ طبقتوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے برہمن فلسفیوں نے اس کو لیکر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتداً تناسخ کی اس مفصل ایکم سے خانی تھا جو بودھ کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی



ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے تہ چلتا ہے، ابتداء میں بودھ و ہرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک دریا ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ تمام عالم کی ایک ہی روح اور تمام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر صورتیں اور قالب پر قالب بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں وحی و الہام کے سرچشمے سے منہدی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا، اس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اچھ کا نتیجہ تھا۔

**عقلی تنقید** یہاں تنازع کے مسئلہ پر کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے مگر اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدہ تنازع کی بنیاد ایسے نظریات پر جو صیح عقل کے خلاف ہیں اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو اب تک انسان کی دنیا اور اس کی زندگی پر غور و خوض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تنازع کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور برے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں بڑے عمل کئے تو وہ حیوانی اور نباتی طبقات کی طرف نزول کرے گا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کئے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نباتی زندگی نتیجہ ہے انسانی زندگی کے بڑے اعمال کا اور انسانی زندگی نتیجہ ہے نباتی اور حیوانی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ یا بالفاظ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نباتی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کئے تھے۔ اور اس وقت جو نباتات اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں بڑے اعمال کئے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے چند اور باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ اور وہ سب علم و عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تنازع کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا دوسرا ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تنازع کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں ازلی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی ازلی اور ابدی ہوں۔ لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہے کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ نفس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا، وہ حیوان کے قالب میں پنچر لا عقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں پنچر اس غریبے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالا ارادہ کئے جائیں اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مرتب ہو سکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے، اور نہ ان پر جزا و سزا مرتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہو گا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالا ارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بڑے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہئے۔ اور جب وہ دوسرے جنم میں وہ بڑا پھل ہم کو ملتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس بڑے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لا محالہ اس سے بڑے ہی اعمال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل

تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے چکر میں نیچے اور نیچے طیفوں ہی کی طرف گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھرا بھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی۔

**تمدن عقیدہ تناسخ کا** ان کے علاوہ اور بہت سے وجوہ ہیں جن کی بنا پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد ہمتوں کو پست کرنے والا، اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے اُھنسا کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں وہ قوار جسمانی کوشش و نماندینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے، اس کے افراد نہ صرف جسمانی اعتبار سے کمزور بلکہ دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں، اور اس دوہرے ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے، اور آخر کار یا تو صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

عقیدہ تناسخ کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا دشمن ہے۔ اور انسان کو ہستی اور ترک دنیا کی طرف لجاتا ہے۔ اہل تناسخ کا اعتقاد یہ ہے کہ روح کو جو چیر گناہوں سے آلودہ کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت روح کو بار بار جسمانی قابلوں میں آکر اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان خواہشات کو پامال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے دھندوں میں پھنسا تو اس کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی بس یہی ایک صورت ہے۔ کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پہننے کے بعد انسان کا خواہشات اور ان کے مقتضیات سبچ جانا محال ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیا سی بن کر جنگوں اور پھاروں

میں جا بیٹھیں۔ اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض حیثیات سے تنازع کا اعتقاد کم از کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو فائدے محض اور عدم مطلق سمجھا جائے۔ کیونکہ انسان میں بقائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تنازع میں ایک حد تک تسکین پا سکتی ہے اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جزا و سزا اور اعمال کے اچھے اور بُرے انجام کا جو تخیل موجود ہے اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لئے پشت پناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اول تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی طرف ہم بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو اسکی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ علمی و عقلی ارتقاء کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اسکی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقا و استحکام کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اسی صورت میں نافع ہوگا جبکہ وہ کتابوں کے بجائے دلوں میں متکون ہو اور لوگ پوری طرح اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجے کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھودیتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ تنازع کا چکر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا؛ اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فعل کی تاثیر اور اس کے نتیجے کو نہیں بدلا جاسکتا تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہیشہ کے لئے گناہ کے پھر میں آجائے گا اور سمجھ لیگا کہ جب مجھے جانور یا درخت بنا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی جون کی تمام لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھا لوں۔ (باقی)